تحقیق وتنقید

فن حدیث میں منہاج تحقیق

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

قرآن کے بعد حدیث اسلامی شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ اور اسلامی تہذیب کا تفصیلی سرچشمہ ہے۔ حدیث کتاب اللہ کی تشریح وتعبیر کے ساتھ اپنا مستقل تشریعی مقام رکھتی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر حدیث میں تحقیقی کام کا رجحان اور میدان وسیع رہا ہے۔ محدثین نے نقدِ حدیث کے جو اصول وضع کیے اور ان کے ساتھ فن اسماء الرجال کو جو ترقی دی وہ دوسرے شعبہائے علم کے طریقہ تحقیق میں بھی رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ حدیث میں تنقید وتحقیق کا طریقہ آج بھی نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور جدید زمانہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تاریخی تنقید بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ کر سکتی ہے۔ بقول ایک محقق کے "محدثین کے اصول تنقید اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ زمانے کے ناقدین کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے، نیز دنیا میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت وسیرت اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے"۔[1]

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی یہاں تک کہتے ہیں "محدثین ہی نے دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں سب سے پہلے اخبار وروایات کی علمی تحقیق وتنقید کے قواعد وضوابط مقرر کیے"۔[2]

---

[1] مولانا مودودی، سنت کی آئینی حیثیت ص ۵۹ طبع لاہور ۱۹۸۶ء

[2] ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ص ۱۰۶ طبع قاہرہ ۱۳۸۰ھ

قرآن بنیاد تحقیق ہے

اس طریقۂ تحقیق کی بنیاد خود قرآن کریم نے فراہم کی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

یٰاَیُّہَا الذین امنوا ان	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر کوئی
جاءکم فاسق بنباً فتبینوا ان	فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر
تصیبوا قوما بجہالۃ فتصبحوا	آئے تو تحقیق کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
علیٰ ما فعلتم نٰدمین	تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو
(الحجرات: ۶)	اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

اس آیت میں تحقیق کا حکم خبر اور خبر لانے والے دونوں سے متعلق ہے اور یہیں سے فن حدیث میں روایت اور درایت کے اصول یعنی حدیث کی سند اور متن کی تحقیق میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ نیز قرآن کریم کی حسب ذیل آیت بھی اسلامی تحقیق کے منہاج کو متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

واذا جاءھم امر من	یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش
الامن او الخوف	یا خوف ناک خبر سن پاتے ہیں اسے
اذاعوا بہ ولو ردوہ الی	لے کر پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر یہ اسے
الرسول والی اولی الامر	رسول یا اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب
منہم لعلمہ الذین	تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم
یستنبطونہ منہم	میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات
(النساء: ۸۳)	کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح
	نتیجہ اخذ کر سکیں۔

قرآن چونکہ اندھی عقیدت اور تقلید جامد کا مخالف ہے اس لیے وہ تحقیق و تنقید اور حق شناسی کو صحت مند اور متحرک علمی زندگی کے لیے لازم قرار دیتا ہے بلکہ عقیدہ جیسے نازک مسائل کو بھی عقل و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

حدیث بھی بنیاد تحقیق ہے

حدیث کی تحقیق و تنقید اور چھان بین کی روایت کو فروغ دینے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بڑا دخل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ایک طرف حدیث کو یاد کرنے اور اس کی حفاظت و اشاعت کی فضیلت بیان فرمائی اور ایسے لوگوں کے لیے جو اس مقدس علمی کام میں اپنا وقت لگائیں دعائیں دیں اور خوشخبریاں سنائیں تو دوسری طرف اپنی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنے پر سخت وعید بھی سنائی۔ آپ نے فرمایا:

من کذب علیّ	جس نے جان بوجھ کر میری جانب
متعمداً فلیتبوا مقعدہ	کوئی جھوٹی بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ
من النار[1]	جہنم ہے۔

چونکہ آپ کا معاملہ عام انسانوں سے مختلف ہے بایں معنی کہ آپ کی ہر بات اپنا تشریعی وزن رکھتی ہے اور آپ کی سنت سرچشمۂ ہدایت اور اساسِ دین ہے اس لیے کوئی بات آپ کی طرف کبھی ایسی منسوب نہیں ہونی چاہیے جو آپ نے نہیں کہی ورنہ دین کے نام پر بے دینی کی اشاعت عمل میں آئے گی چنانچہ آپ نے خود ہی فرمایا:

ان کذبا علی لیس	میری جانب کوئی جھوٹی بات منسوب
ککذب علی احد من	کرنا ایسا نہیں جیسے کسی عام شخص کی
کذب علی متعمداً	جانب کوئی جھوٹی بات منسوب کر دی
فلیتبوأ مقعدہ من	جائے۔ جس نے جان بوجھ کر میری جانب
النار[2]	کوئی جھوٹی بات منسوب کی اس کا
	ٹھکانا جہنم ہے۔

اس کے نتیجہ میں محدثین اور اصولیین حدیث کے قبول و اشاعت کے معاملے میں نہایت حساس اور محتاط ہو گئے اور پھر انھوں نے صحت و سقم کو پرکھنے کے

---

[1] بخاری و مسلم

[2] مسلم مقدمہ باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لیے ایسی کسوٹیاں بنائیں کہ عام انسانی تاریخ اور علوم وفنون کے معیار سے ہزار ہا درجہ سخت اور بلند کہی جا سکتی ہیں۔ اور یہ علمی تحقیق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

صحابہ کرام نے اس طریقہ تحقیق کو اپنایا

صحابہ کرام جنھوں نے حالت ایمان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور اسی پر ان کا انتقال ہوا۔ ہمارے نزدیک امت کے بہترین لوگ ہیں اور وہ صادق وعادل ہیں وہ اپنے باہمی معاملات میں جھوٹ نہیں بولتے تھے جن میں نفع ونقصان کا پہلو ہوتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں تو وہ گویا ہلاک ہونا زیادہ پسند کرتے بجائے اس کے کہ کوئی جھوٹی بات آپ کی طرف منسوب کریں۔ چنانچہ حضرت علی فرماتے ہیں "میں جب تم لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں تو مجھے آسمان سے گر جانا پسند ہے مگر آپ کی طرف جھوٹ کا انتساب پسند نہیں"[1]

مگر جھوٹ اور غلط بیانی سے احتیاط کرنے کے باوجود اس بات کا پورا احتمال موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سننے میں، مفہوم کو سمجھنے میں یا موقع ومحل کو متعین کرنے میں کسی صحابی کو غلط فہمی ہوگئی ہو اس لیے یہاں تحقیق کے دونوں اصولوں روایت اور درایت سے کام لیا گیا مثال کے طور پر حضرت ابوہریرہ نے نبی کریمؐ کے حوالے سے بیان کیا کہ گھر، عورت اور سواری میں نحوست اور بدبختی پائی جاتی ہے۔ یہ بات جب حضرت عائشہ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا ابوہریرہؓ نے پوری بات نہیں سنی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہود پر لعنت کر رہے تھے کہ وہ عورت، گھر اور سواری میں بدبختی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ابوہریرہؓ نے پوری بات نہیں سنی اور آخری جملہ کو آپ کا قول بتا دیا[2]

حضرت ابوہریرہؓ کی عدالت وثقاہت میں کوئی کلام نہیں مگر انھوں نے

---

[1] بخاری، کتاب المناقب

[2] مسند ابوداؤد الطیالسی، مسند عائشہ۔

غلط فہمی کی بنیاد پر یہود کے عقیدہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بتا دیا حضرت عمرؓ سے حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نے کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفقہ اور سکنیٰ کا حکم نہیں دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں ایک عورت کی وجہ سے کلام اللہ اور سنت رسول اللہ نہیں چھوڑ سکتا، کیا پتہ اس نے اس کو صحیح طریقہ سے محفوظ رکھا یا بھول گئی[1]

خلفاء اربعہ حدیث بیان کرنے والوں سے شہادت اور قسم اس لیے طلب کرتے تھے کہ حدیث کی قطعیت یا ثبوت تک پہونچ جائے۔ اس طرح کی مثالیں بتاتی ہیں کہ خود صحابہ نے علم کے طریقہ تحقیق کو نہ صرف اپنایا بلکہ حدیث کے اخذ وقبول میں اسے پوری طرح لاگو کیا۔

روایت اور درایت

حدیث کی تحقیق وتنقید کے لیے عام طور پر دو قسم کے طریقۂ کار وضع کیے گئے۔ پہلا طریقہ تحقیقِ روایت ہے۔ یہ طریقۂ تحقیق زیادہ عام اور مشہور رہا ہے اور حدیث کی تحقیق میں زیادہ تر اسی سے کام لیا گیا ہے، اس میں حدیث کے اصول، جرح وتعدیل اسماء الرجال، عِلل اسناد، راوی کی اخلاقی ودینی حالت، حفظ وضبط، عدالت وثقاہت اعتقادی وفکری کی کیفیت وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس اصولِ تحقیق کی رو سے حدیث کے دو بنیادی اقسام کیے گئے ہیں متواتر اور آحاد۔ متواتر وہ احادیث ہیں جن کے راوی ہر دور میں اتنی تعداد میں رہے ہوں کہ ان سب کا کسی غلط بات پر اتفاق کرنا مشکل ہو، حدیث متواتر میں اگر قولی روایات کو لیا جائے تو ایسی احادیث بہت کم ہیں لیکن اگر عملی روایات یعنی تعامل وتوارث کو لیا جائے تو احادیث کا بڑا حصہ متواتر کہلانے کا مستحق ہے چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ:

"تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرہ کے ایک بڑے حصے کو میں متواتر خیال کرتا ہوں یعنی بغیر کسی انقطاع کے لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کروڑہا

---

[1] مسلم، کتاب الطلاق

کروڑ انسانوں کے ذریعہ سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہونچا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ طہارت و غسل، وضو، عبادات، نماز، روزہ حج، زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محظورات وغیرہ مختلف ابواب کے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقۃً بعد طبقۃٍ، خلفاً عن سلفٍ تواتر کے ساتھ اس حقیقت سے مسلم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرز عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی[1]

خبر واحد جس کے رواۃ متواتر سے کم ہوں محدثین کے اصول تحقیق و تنقید اور بحث و تمحیص کا زیادہ تر موضوع رہی ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔ مشہور، عزیز اور غریب۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

علم الاسناد یبحث	علم الاسناد وہ علم ہے جس میں
فیہ عن صحۃ الحدیث	حدیث کی صحت و ضعف کی تحقیق
وضعفہ لیعمل بہ او یترک	کی جاتی ہے۔ راویوں کے حالات
بہ من حیث صفات	معلوم کیے جاتے ہیں اور متن حدیث
الرجال وصیغ الاداء والتواتر	میں غور کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ واضح
لا یبحث عن رجالہ بل	ہو سکے کہ یہ حدیث واجب العمل
یجب العمل بہ من غیر بحث[2]	ہے یا لائق ترک۔

اور اس کے لیے علم الاسناد، اسماء الرجال روایت کی اقسام صحیح، حسن، ضعیف مقلوب، مضطرب، مدلس، موضوع وغیرہ کے ذیلی اصول وجود میں آئے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ کسی بات کا وزن بیان کرنے والے کی شخصیت سے متعین ہوتا ہے اس

---

[1] مولانا مناظر احسن گیلانی، تدوین حدیث ص۵۳ طبع کراچی ۱۹۵۶ء

[2] ابن حجر، نزہۃ النظر فی توضیح نخبۃ الفکر ص۱۲ طبع دہلی ۱۹۰۲ء

لیے اسناد کے اصول کو حدیث کی تحقیق کے سلسلہ میں سختی سے برتا گیا، صحابہ جیسے عادل وصادق حضرات کے معاملہ میں سند اور تحقیق سند کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اسی طرح بہت حد تک تابعین عظام کے معاملہ میں بھی مگر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی روایات منسوب کی جانے لگیں جن کے متعلق آنجنابؐ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی:

سیکون فی اٰخر امتی	میری امت کے آخری زمانے میں کچھ
اناس یحدثونکم بما لم	ایسے لوگ ہوں گے جو تم سے ایسی ایسی
تسمعوا انتم ولا اٰباؤکم	چیزیں بیان کریں گے جنھیں نہ تم نے کبھی
فایاکم وایاھم [1]	سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء واجداد نے تم
	ان سے بچ کر رہنا۔

تو اسناد کی تحقیق کا طریقہ کار وضع کیا گیا۔ ابن سیرین فرماتے ہیں "پہلے دور میں لوگ اسناد کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے مگر جب فتنہ پیدا ہونے لگا تو لوگ اسناد کے بارے میں تفتیش کرنے لگے [2]

عبداللہ بن مبارک نے فرمایا:

الاسناد من الدین	علم الاسناد دین کا حصہ ہے۔ اگر
لولا الاسناد لقال من شاء	یہ علم نہ ہوتا تو ہر شخص کو کھلی چھوٹ ہوتی
ما شاء [3]	کہ جو چاہے کہے۔

چنانچہ محدثین نے خبر واحد کو قبول کرنے کے لیے راویوں کے لیے حسب ذیل شرطیں قرار دیں۔

عقل۔ ضبط۔ عدالت اور اسلام۔ شافعی اصولیین نے مکلف ہونے

---

[1] مسلم، مقدمہ، باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء.....

[2] خطیب بغدادی کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد ۱۳۹۰ھ

[3] معرفۃ علوم الحدیث ص ۶ دار الکتب المصریہ ۱۳۹۶ھ

کی شرط کا اضافہ کیا ہے مگر تمام علماء کے نزدیک یہ عقل ہی میں شامل ہے۔ خبر واحد کی صحت قطعیت اور حجیت کے سلسلہ میں علماء کے رویّے مختلف رہے ہیں اور کسی قدر افراط و تفریط کا مظاہرہ بھی کیا گیا ہے۔ ایک طبقہ نے اسے غیر یقینی اور ظنی الثبوت کہہ کر دین کے بڑے حصّے کو غیر قطعی بنا دیا اور دوسرے طبقہ نے اس کے منکرین کو کافروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ خبر واحد کے سلسلے میں معتدل رویہ اور سنت متواترہ کے درجہ کی نہیں ہے اس لیے منکرین کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ وہ دین میں حجت ہیں۔

متابعات، شواہد اور اطراف

محدثین کے طریقۂ تحقیق میں خبر احاد کو قطعی الثبوت اور واجب العمل کے مقام تک پہنچانے کے لیے متابعات و شواہد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان حضرات نے یہ کوشش کی ہے کہ ایک روایت جتنے لوگوں سے مروی ہو ان سب سے بحد امکان حدیث سنی جائے ایک ہی روایت جب متعدد طریقوں سے بیان کی جاتی ہے تو اس کی صحت اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لیے محدثین اور رواۃ نے لمبے لمبے اسفار بھی کیے، بعد میں متابعات و شواہد جمع کرنے کا رجحان عام ہوتا گیا۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث 'إنما الاعمال بالنیات' سات سو طریقوں سے مروی ہے[1] امام مسلم اور امام ترمذی کے طریقۂ تحقیق میں اس کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ کتب حدیث میں ایک روایت کہیں اجمالاً آتی ہے اور دوسری جگہ تفصیل سے۔ کہیں حدیث کا ترجمہ الباب کی مناسبت سے بیان کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ دوسرا حصہ یا تمام حصے، مختلف مقامات پر ایک حدیث کے جتنے پہلو ہوتے ہیں ان کو جمع کرنا "اطراف" میں شامل ہے۔ محدثین کی یہ کوشش روایت یعنی سند کی جانچ کے لیے بھی معاون ہوتی ہے اور متن کی تحقیق میں تو سب سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اسی لیے روایت کی تحقیق کے لیے 'کتب اطراف' کا جاننا از حد ضروری سمجھا گیا ہے۔

---

[1] تدوین حدیث ص ۵۴

روایات احکام میں اسناد کی سختی

حدیث کی آئینی اور تشریعی حیثیت کے پیش نظر محدثین نے احکام اور فضائل کی روایات میں قدرے فرق و امتیاز سے کام لیا ہے، احکام و مسائل، معاملات وعقائد وغیرہ کے باب میں جو روایات آئیں محدثین نے ان کی اسناد کی تحقیق و تنقید میں سختی سے کام لیا مگر فضائل کے باب میں کسی قدر نرمی سے کام لیا کیونکہ اس کا تعلق کسی معاملہ کی حلّت و حرمت سے نہیں ہوتا چنانچہ احمد بن حنبل فرماتے ہیں "جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور سنن و احکام سے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو اسناد میں سختی برتتے ہیں اور جب فضائل اعمال سے متعلق روایت کرتے ہیں تو اسناد میں نرمی اختیار کرتے ہیں"[1]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فضائل کے باب میں ہر طرح کی روایات قابلِ قبول اور قابل اشاعت ہیں۔ جہاں تک موضوع روایات کا تعلق ہے محدثین نے ان کی روایت کو قطعی حرام قرار دیا ہے خواہ ان کا تعلق اعمال سے ہو یا فضائل اعمال سے، البتہ ضعیف روایات کے سلسلہ میں محدثین کے دو گروہ پائے جاتے ہیں ایک گروہ کے نزدیک ضعیف روایات قبول ہی نہیں کی جاسکتی ہیں حتی کہ فضائل میں بھی نہیں قبول کی جاسکتی۔ ابوبکر ابن عربی وغیرہ اسی کے قائل ہیں، دوسرے محدثین نے اگرچہ فضائل کے باب میں ان کو گوارہ کیا ہے مگر وہ کچھ شرطیں عائد کرتے ہیں۔

(۱) شدید ضعف نہ ہو۔ (۲) کوئی مسئلہ (اصل شرعی) ثابت نہ کیا جائے۔ (۳) روایت کا ضعیف ہونا بیان کر دیا جائے اور روایات پر عمل کرتے وقت صحیح حدیث سمجھ کر عمل نہ کیا جائے بلکہ احتیاط ملحوظ رہے[2] ضعیف روایات کبھی درجہ حسن کو بھی پہونچ جاتی ہیں اور کبھی موضوع بھی ثابت ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر اس ضعیف

---

[1] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۲۸

[2] تدریب الراوی ص ۲۹۸ ج ۱ طبع مصر ۱۳۸۵ھ

کو فضائل میں قبول کرتے ہیں جو درجہ حسن کی ہو۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں "شریعت میں صرف صحیح اور حسن احادیث ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ ضعیف احادیث لینا روا نہیں البتہ امام احمد وغیرہ بعض علماء نے فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کی روایت جائز رکھی ہے بشرطیکہ ان کا جھوٹ ثابت نہ ہو گیا ہو اور یہ اس بنا پر کہ جب کوئی عمل دلیل شرعی سے ثابت ہو جائے کہ مشروع ہے اور اس کی فضیلت میں ضعیف حدیث روایت کی جائے بشرطیکہ وہ جھوٹی نہ ہو تو خیال ہوتا ہے کہ ثواب درست ہو گا۔ لیکن کسی امام نے بھی یہ نہیں کہا کہ ضعیف حدیث سے کوئی عمل بھی واجب یا مستحب قرار دیا جا سکتا ہے جو کوئی یہ کہتا ہے مخالفِ اجماع ہے۔[1]

امام ابن تیمیہ کے شاگرد اور محقق، مفسر اور محدث علامہ ابن کثیر م ۷۷۴ھ ضعیف روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

لایجوز روایتهما الا ببیان ضعفهما[2]	ان دونوں کی روایت ان کا ضعف بیان کیے بغیر جائز نہیں۔

محدثین کرام نے اسناد کی تحقیق میں اس قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے کہ اس راہ کی ایک ایک ممکنہ کمزوری کی نشاندہی کی اور اس کا حکم بیان کیا مثلاً راوی حدیث بیان کرتے وقت اپنے شیخ کا نام نہ لے، راوی کسی مجہول الحال آدمی سے روایت کرے، راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ہی نہ ہو، راوی کسی شخص کو درمیان سے چھوڑ دے۔ راوی اپنے سے ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے۔ راوی تابعی کو چھوڑ کر براہ راست صحابی سے روایت کرے۔ تابعی صحابی کا واسطہ چھوڑ کر رسول کریمؐ سے روایت کرے وغیرہ۔ ان سب کے بارے میں محدثین نے قطعی ضوابط بنائے۔ اس آخری کمزوری کو لیجئے کہ تابعی صحابی کو چھوڑ کر رسول کریمؐ سے روایت کر دے اس کو اصطلاح حدیث میں "مرسل" کہا

---

[1] ابن تیمیہ: کتاب الوسیلہ، مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی ص ۱۳۰/۱۳۱ کریمی پریس لاہور ۱۹۲۵ء

[2] تفسیر ابن کثیر ۱/۱۶۸ - طبع دار الفکر سنہ ۱۹۸۰ء

جاتا ہے۔ حدیث مرسل عام طور پر محدثین کے نزدیک حجت نہیں، مگر امام مالک کی مراسیل اور "بلغنی" سے جو احادیث وہ ذکر کرتے ہیں ان کو وزن دیا جاتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امام مالک اور نبی کریمؐ کے درمیان واسطے بہت کم ہیں بلکہ بعض روایات صرف دو واسطوں یعنی حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہیں اس لیے سند کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے درمیان رائج شدہ عمل کو بھی سند مانتے ہیں اور اسے حدیث کی تشریح وتعبیر میں اہمیت دیتے ہیں اس طرح مرسل روایات کو دوسری راہ سے تقویت ملتی ہے انھوں نے اپنی کتاب الموطا میں تقریباً ساٹھ مرسل روایات ذکر کی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ صرف چار مرسل روایات کے علاوہ تمام مراسیل کا مسند ومرفوع ہونا دوسرے طریقوں سے ثابت ہے۔"[1]

سلسلہ سند کی کمزوری

سند میں سختی برتنے کے بعد بھی اس کا امکان بہرحال موجود تھا کہ کوئی بددین جھوٹی سند وضع کرکے کوئی من گھڑت روایت بیان کردے۔ محدثین نے اس راہ کی کمزوری کا سراغ لگانے کے لیے تاریخ کا استعمال شروع کیا مثال کے طور پر عنبر بن معدان الکلاعی کا بیان ہے کہ عمر بن موسیٰ نامی راوی جب حمص آیا تو ہم اس کے پاس مسجد میں جمع ہوئے اس نے کہا مجھ سے روایت کی تمہارے صالح شیخ نے اور بار بار یہ جملہ دہرایا تو میں نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ یہ صالح شیخ کون ہیں؟ اس نے کہا خالد بن معدان ہیں میں نے پوچھا کس سال تمہاری ملاقات ہوئی وہ بولا آرمینیہ کے جہاد میں میں نے کہا شیخ اللہ سے ڈر خالد بن معدان ۱۰۳ھ میں وفات پاگئے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ ان کی وفات کے چار سال بعد تم ان سے ملے۔ پھر انھوں نے روم کے جہاد میں تو حصہ لیا ہے آرمینیہ کے جہاد میں کبھی شریک نہ ہوئے۔"[2]

---

[1] مولانا محمد زکریا کاندھلوی: مقدمہ اوجز المسالک طبع لکھنؤ

[2] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۵۸

درایت

ان تمام کوششوں کے باوجود (جو راوی کی حالت کو جاننے کے لیے کی گئیں) یہ گنجائش اب بھی رہ جاتی ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک روایت سند کے معیاروں پر پوری اترتی ہو اور کہیں کوئی ضعف اور کمزوری نہ ہو مگر وہ حدیث رسولؐ نہ ہو محدثین کا زور اور ان کے اصول کا بڑا پہلو اگرچہ روایت ہی کی تحقیق پر ہے مگر انھوں نے اس کمزوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس کی گرفت کرنے کے لیے بھی تحقیق و تنقید کی کسوٹیاں بنائیں چنانچہ قرآن کریم میں خود روایتی معیار کے استعمال کی بنیاد رکھی مثلاً حضرت عائشہؓ پر جب منافقین اور ان کے ساتھ بعض صحابہ نے تہمت لگائی تو قرآن کریم نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

لولا اذ سمعتموہ قلتم	کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا
مایکون لنا ان نتکلم بہذا	کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا ہی
سبحانک ھٰذا بہتان	زیب نہیں دیتا سبحان اللہ یہ تو ایک
عظیم" (سورۃ النور: ۱۶)	بہتان عظیم ہے۔

اس تہمت میں بعض صحابہ بھی ملوث ہو گئے تھے اگرچہ ان کی ثقاہت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا، مگر قرآن نے توجہ دلائی کہ یہ واقعہ ناقابل تسلیم تھا تم نے پہلے ہی کیوں نہ اسے مردود ٹھہرایا۔ صحابہ کرام نے بھی اس اصول تحقیق سے استفادہ کیا۔ محدثین نے روایت کی جانچ کے لیے حسب ذیل درایتی معیار مقرر کیے اور کہا کہ ایسی روایت غیر معتبر ہے جن میں حسب ذیل عیوب میں سے کوئی ایک چیز موجود ہو:

(۱) عقل سلیم کے خلاف ہو۔ (۲) اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔ (۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو (۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو (۵) جس حدیث میں معمولی کام پر بے پایاں اجر اور معمولی گناہ پر عذاب الیم کی وعید ہو۔ (۶) رکیک المعنی ہو۔ (۷) راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات نہ ہو اور اس

لہ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ صہ ۱۵۸

سے کوئی روایت نہ کرتا ہو۔ (۸) ایسی روایت جس سے عام لوگوں کو واقف ہونا چاہیے مگر راوی کے علاوہ کسی نے روایت نہ کی ہو۔ (۹) ایسا واقعہ ہو جسے عوام کو جاننا چاہیے مگر صرف راوی جانتا ہو (۱۰) روایت کلیہ کے خلاف ہو (۱۱) روایت میں کسی قوم یا طبقہ کی مذمت ہو (۱۲) کسی پیشہ یا صنعت کی مذمت ہو۔ (۱۳) نام، تاریخ اور مقام کے تعیین کے ساتھ پیشین گوئی ہو (۱۴) شانِ نبوت کے منافی ہو (۱۵) شانِ خداوندی کے منافی ہو وغیرہ [۱]

علامہ ابن الجوزی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "ہر وہ روایت جو عقل کے منافی، قرآن وسنت کے مخالف اور اصول سے متناقض ہو تو اسے سمجھو کہ وہ غیر معتبر ہے۔" مگر درایتی معیار بیان کرنا جتنا آسان ہے اس کو بروئے کار لانا اور حدیث کی تحقیق وتخریج میں اس کو بنیاد بنانا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ تمام اصول اگر ایک اہل علم کو برتنے کے لیے دے دیئے جائیں تو وہ صحیح احادیث کے بیشتر ذخیرہ کو نامعتبر قرار دے گا کیونکہ اس کے فہم کے مطابق کوئی نہ کوئی روایت کسی معیار پر پوری نہ اتر رہی ہوگی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسماء الرجال کی طرح درایت کے استعمال کے لیے بھی حدیث کے فن میں مہارت اور طویل ممارست لازم ہے۔

علامہ ابن قیم الجوزیہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا صرف درایت کی بنیاد پر کسی روایت کو موضوع قرار دیا جا سکتا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: "یہ بڑا اہم سوال ہے یہ وہی شخص جان سکتا ہے جو سنن پر حاوی ہو اور اس کے خون اور گوشت میں وہ مخلوط ہو گئی ہوں اور ان پر اسے ملکہ حاصل ہو گیا ہو۔ سنن اور آثار کو پہچاننے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پہچاننے میں، رسول کریم کے اوامر ونواہی، دعوت وخبر، پسند وناپسند اور تعلیم وتربیت سب جان لینے میں اسے اختصاص اور مہارت حاصل ہو گئی ہو، گویا وہ حضور کے ساتھ صحابہ کرام سے ملا ہوا ہے اس قسم کا انسان آنحضورؐ کے افعال واحوال اور اقوال کو جان سکتا ہے۔" [۲]

---

[۱] دیکھئے ابن قیم کی المنار المنیف، طبع حلب ۱۹۸۰ء اور ملا علی قاری کی موضوعات کبیر طبع مصر ۱۳۸۹ء

[۲] المنار المنیف ص ۴۴

درایت کی بنیاد پر صحیح السند حدیث بھی رد کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال حدیث زہرہ ہے جسے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا زہرہ ایک خوبصورت عورت تھی جو ایران کی رہنے والی تھی وہ اپنا مقدمہ دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے پاس لے گئی توان دونوں نے اس عورت کو بدکاری کے لیے بہکایا تو عورت نے کہا یہ اسی وقت ممکن ہے کہ تم لوگ وہ کلمہ مجھے سکھا دو جس کو پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں ان دونوں نے وہ کلمہ اسے سکھا دیا اور وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور اسے ستارہ زہرہ بنا دیا گیا۔ اس روایت پر نقد کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

"وھذا الاسناد رجالہ ثقات — اس سند کے لوگ تو ثقہ ہیں مگر روایت
وھو غریب جدا "[1] — انتہائی غریب ہے۔

تحقیق وتخریج اور تنقید حدیث میں روایت و درایت کا اہم پہلو یہ دیکھنا بھی ہوتا ہے کہ راوی نے جو واقعہ بیان کیا ہے یا جو قول نقل کیا ہے وہ کس حد تک واقعی اور حضور کی منشا و مقصد کے مطابق ہے اور کس حد تک راوی کا اپنا تاثر اور طرز تعبیر اس میں شامل ہے۔ کبھی واقعہ تھوڑا ہوتا ہے مگر اس کی روایت میں راوی کا تاثر وطرز بیان اس طرح شامل ہوجاتا ہے کہ واقعہ کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ ایک موقع پر جب نبی اکرمؐ نے اپنی ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تو صحابہ کرام میں یہ خبر عام ہوگئی کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے حضرت عمر یہ سن کر مسجد نبوی میں آئے تو صحابہ جمع تھے اور اس واقعہ سے پریشان تھے۔ حضرت عمر نبی اکرم کے پاس گئے اور صحیح صورت حال دریافت کی تو آپ نے طلاق دینے کی خبر کو غلط بتایا۔

محدثین اور اصولیین کے یہاں تحقیق حدیث میں ایک اور معاملہ انتہائی اہم ہے اور بڑا نازک بھی ہے وہ یہ ہے کہ کبھی روایات میں اختلاف اور تعارض کی شکل پیدا ہوجاتی ہے اگرچہ احادیث میں اختلاف وتعارض کم ہے لیکن کچھ روایات ایسی ضرور آتی ہیں جن میں یہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس معاملہ میں اصولیین نے الگ الگ منہاج قائم کیے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ١/١٤٠

جب ایک سے زیادہ روایات باہم متعارض ہوں تو امام ابوحنیفہ قدر مشترک نکالنے پر زور دیتے ہیں اور یہ بھی مشکل ہو تو پھر عملی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی مشکل ہو تو وہ روایت قابل ترجیح ہوتی ہے جس کا راوی فقیہہ ہو۔ مثلاً عمر بن دینار نے جابر بن زید ابوالشعثاء سے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام حضرت میمونہؓ سے شادی کی تھی۔ عمرو بن دینار نے جابر بن زید سے کہا کہ ابن شہاب زہری نے مجھے بتایا ہے کہ یزید بن الاصم نے کہا کہ نبی اکرمؐ نے حضرت میمونہؓ سے جب شادی کی تھی اس وقت آپ حالت احرام میں نہیں تھے جابر بن زید نے جواب میں کہا کہ حضرت میمونہ ابن عباس کی خالہ تھیں ان کے حالات سے وہ زیادہ باخبر تھے تو عمر بن دینار نے اس کا جواب دیا کہ حضرت میمونہ یزید بن الاصم کی بھی خالہ تھیں اس پر جابر نے کہا "یزید بن الاصم جو پیشاب کرنے میں احتیاط نہیں ملحوظ رکھتے تھے ان کا ابن عباس سے کیا مقابلہ؟"

امام مالک تعارض و اختلاف روایات کی صورت میں تعامل اہلِ مدینہ کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کسی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

امام شافعی "اصحہما فی الباب" کی ترجیح کے قائل ہیں۔ یعنی وہ باعتبار سند اہم اور قوی روایت کو قبول کرتے ہیں اور امام احمد بن حنبل اس صورت میں اسلاف کے عمل کو حجت مان کر ترجیح و انتخاب کا معاملہ کرتے ہیں۔ ان مناہج سے حدیث کی تحقیق میں بھی کبھی اور مسائل کے استخراج و استنباط میں بھی مدد ملتی ہے۔

آخر میں محدثین اور سیرت نگاروں کے مناہج تحقیق کے درمیان فرق بیان کر دینا مناسب ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام و مسائل کو جاننا ہوتا ہے اور رسول کریم کی ذات گرامی سے ان کی بحث ضمناً یا التزاماً ہوتی ہے اور اصحاب سیرت کا مقصود بالذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے واقفیت فراہم کرنا ہوتا ہے اور احکام و مسائل سے ان کی بحث ضمناً ہوتی ہے محدثین رواۃ کی ثقاہت، عدل، تقویٰ اور دیانت کی کمی و زیادتی کی بنا پر روایتوں میں اختلاف کے وقت مقبول روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اصحاب سیرت حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں اور جب قولی اور عملی روایات میں اختلافات

نظر آئے تو اصولیین قولی روایت کو عملی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔

علم حدیث میں علم اسماء الرجال اور فن جرح وتعدیل کے ضوابط کی تعیین سے دوسرے علوم میں تنقید وتحقیق کی راہ آسان ہوتی ہے۔ علم حدیث کے ان بے مثال اصولوں سے علم الانسان، علم العمران اور علم الاجتماع ہر جگہ استفادہ کیا جا سکتا ہے علامہ شمس الدین ذہبی کی میزان الاعتدال فی نقد الرجال، علامہ ابن اثیر جزری کی جامع الاصول، حافظ ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب اور لسان المیزان حافظ منذری کی تذکرۃ الحفاظ وغیرہ اس فن کی متداول کتابیں ہیں جن کو بنیادی کتب کہا جا سکتا ہے۔

صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات

از

مولانا سید جلال الدین عمری

اسلام نے حفظانِ صحت پر کس قدر زور دیا ہے؟ اور طہارت ونظافت، غذا کے صحیح استعمال، کھانے پینے کے آداب اور جسمانی ورزش کو کتنی اہمیت دی ہے؟ علاج کو شریعت کس نظر سے دیکھتی ہے؟ کیا وقت ضرورت محرمات سے علاج ہو سکتا ہے۔؟ خودکشی اور قطع حیات کیوں منع ہے؟ روحانی علاج کیا ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں؟ مریض کی عیادت اور خدمت کا دین میں کیا مقام ہے؟ اس کتاب میں ان پر اور ان جیسے دیگر اہم عصری مسائل پر معروف محقق مولانا سید جلال الدین عمری نے سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے۔

اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب جو عوام وخواص کے علاوہ مسلم طبیبوں اور ڈاکٹروں کے لیے بھی مفید ہے۔

آفسیٹ کی حسین طباعت۔ عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل۔ صفحات : ۳۸۸

قیمت مجلد : ۷۰/=

ملنے کے پتے: (۱) مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۲

(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵